تھا۔ امام شافعی کی رائے تو شوکانی نے بھی نقل کر دی ہے۔ ابن حزم جن کے اقوال پر مجتہدین بڑے زور شور سے نقل کرتے ہیں ان کی رائے بھی سن لیجیے ان کا خیال بھی وہی ہے کہ حضرت عمرؓ نے ان غانمین کو جو متفق نہ تھے معاوضہ دے کر راضی کیا تھا۔ ان کے اصل الفاظ یوں ہے۔

تقسم الارض وتخمس كسائر الغنائم، فان ابت نفوس المجاهدين على تركها: اوقفها للمسلمين والا فلا۔ ومن اسلم بضيعة كان من لم يسلم حقه لا يجوز غير ذلك۔

یعنی جیسے اور غنائم تقسیم ہوں گے ویسے زمین بھی تقسیم کرنا لازمی ہو گا مگر یہ کہ مجاہدین اپنی رضا و رغبت سے اپنا حصہ چھوڑ دیں تو پھر مفتوحہ زمین کو تمام مسلمانوں کے لیے وقف کر دیا جائے گا ورنہ وقف نہیں کیا جا سکتا ابن حزم نے اس سلسلے میں اپنے قول تائید میں جہاں احادیث و آثار کا حوالہ دیا ہے وہاں قرآنی آیت کا بھی حوالہ دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہمارا قول اللہ کی اس آیت سے ثابت ہوتا ہے (فكلوا مما غنمتم حلالا طيبا) یعنی جو بھی تم کو غنیمت میں ملے اسے حلال اور طیب سمجھ کر کھاؤ۔[1]

گویا اس میں زمین اور غیر زمین کی تفریق قرآن نے نہیں کی ہے۔

ابن حزم نے تو حضرت عمرؓ کے اس قول کا حوالہ دے کر اگر میں آئندہ سال زندہ رہا تو مفتوحہ تمام زمین غانمین میں اسی طرح تقسیم کر دوں گا جس طرح حضور علیہ وسلم نے خیبر کی زمین تقسیم کی تھی۔

یہ نتیجہ نکالا ہے کہ حضرت عمرؓ نے اپنے سابقہ فیصلہ سے رجوع کر لیا تھا۔[2]

ابن حزم کا اصل مطلب یہی ہے کہ ملکیت کے معاملے میں زمین اور دیگر اموال میں کوئی فرق نہیں تھا بلکہ اس طرف اشارہ تھا کہ اگر پہلے میں نے حضورؐ کی ایک سنت پر عمل کیا تھا تو آئندہ کے لیے مجھے اس میں مصلحت نظر آ رہی ہے حضورؐ کی دوسری سنت پر عمل کروں۔ پس ثابت ہوا کہ حضرت عمرؓ کبھی بھی سنت کے خلاف عمل نہ کرتے تھے بلکہ ہر ہر سنت پر عمل کرنے کے حریص تھے۔

---

[1] ابن حزم: المحلی: ۷: ۳۴۱-۳۴۳

[2] ابن حزم: المحلی: ۳۴۳

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اُولِی الاَمرِ مِنکُم

(احکام خلیفہ کی شرعی حیثیت بحیثیت مصدر شریعت)

ادارے کا مقالہ نگار کی رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں

مولانا محمد امین صاحب، ریسرچ سکالر، ریاض۔ سعودی عرب

زیر نظر موضوع پر براہِ راست گفتگو سے پہلے دو بنیادی باتوں کا ذکر ضروری ہے ایک تو یہ کہ شریعت کیا ہے اور اس کے مصادر کیا ہیں؟ اور دوسرے یہ کہ "اولی الامر" کی صحیح حیثیت اسلام کے سیاسی نظام میں کیا ہے؟

شریعت اور اس کے مصادر

اسلام میں احکام دو طرح کے ہیں ایک وہ جو نصوص قطعیہ پر مشتمل ہیں اور دوسرے وہ جو اجتہاد پر مبنی ہیں۔ ان دو طرح کے احکام میں بعض بنیادی قسم کے فرق پائے جاتے ہیں مثلاً احکام منصوصہ اگر قطعی النص اور قطعی الدلالۃ ہوں تو وہ حرفِ آخر ہیں۔ ان میں قیل وقال اور اجتہاد کی ذرا گنجائش نہیں۔ ان کا مصدر ایک ہی ہے اور وہ وحی ہے (یعنی قرآن وسنت)۔ اس کے برعکس وہ احکام جو اجتہاد پر مبنی ہیں وہ اگرچہ نصوص ہی سے مستنبط شدہ اور نصوص ہی میں بیان کردہ اصول وقواعد کی روشنی میں وضع کئے جاتے ہیں لیکن بہرحال ان کے وجود پذیر ہونے میں عقلِ انسانی کا دخل ہے، لہٰذا ان میں غلطی اور خطاء کا امکان بہرقیمت موجود

ہے اور وہ ظن تک تو پہنچاتے ہیں، یقین اور قطع تک نہیں پہنچاتے۔ ان کا مصدر بھی قرآن و سنت کے علاوہ اجتہاد کے مختلف وسائل اور طریقے ہیں (مثلاً قیاس و استنباط، استحسان، عرف اور مصالح مرسلہ وغیرہ)

اب اگر کوئی یہ کہے کہ یہ دونوں طرح کے احکام "شریعت" ہیں تو یہ غلط مبحث ہوگا اور اس سے کئی پیچیدگیاں جنم لیں گی۔ اس نقطۂ نظر کو تسلیم کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ فقہ بھی شریعت ہے اور فقہاء بھی شارع اور مشروع ہیں، حالانکہ یہ بات اسلام میں طے شدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے سوا اور کوئی شارع نہیں۔

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ.... [1]

حکم (فرمانروائی) کا اقتدار اللہ کے سوا کسی کے لیے نہیں ہے۔

اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ... [2]

اسی کا ہے خلق اور اسی کا ہے امر۔

يَقُوْلُوْنَ هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَيْءٍ، قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ"... [3]

یہ لوگ کہتے ہیں کہ اختیارات (فرمانروائی) میں کچھ ان کا حصہ بھی ہے، کہو فرمانروائی سراسر اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو شارع اس لیے کہا جاتا ہے کہ خود خدا نے ان کو تشریع کی اجازت دی ہے۔

وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ... [4]

اور نبی ان کے لیے پاک چیزیں حلال اور ناپاک چیزیں حرام کرتا ہے اور ان پر سے وہ

---

[1] یوسف: ۴۰

[2] الاعراف - ۵۴

[3] آل عمران - ۱۵۴

[4] الاعراف - ۱۰۷

بوجھ اتارتا ہے جو ان پر لدے ہوئے تھے اور وہ بند شیں کھولتا ہے جن میں وہ جکڑے ہوئے تھے۔

لہٰذا خدا اور اس کے رسول کے علاوہ کوئی شارع نہیں اور اگر کوئی یہ دعویٰ کرے بھی تو وہ مردود ہے:

"وَلَا تَقُولُوا لِمَا تَصِفُ أَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هَٰذَا حَلَالٌ وَهَٰذَا حَرَامٌ"۔ [1]

اور نہ کہو وہ جو تمہاری زبانیں جھوٹے احکام لگاتی ہیں کہ یہ چیز حلال ہے اور وہ حرام۔

وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ" [2]

اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی کافر ہیں۔

وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ۔ [3]

اور جو اسلام کے سوا کوئی اور طریقہ اختیار کرنا چاہے تو وہ طریقہ ہرگز قبول نہ کیا جائے گا۔

لہٰذا شریعت کا اطلاق صرف ان احکام و قوانین پر ہونا چاہیے جو خدا اور رسولؐ کی طرف سے ہیں نہ کہ ان قوانین پر جو فقہاء کے اجتہادات پر مبنی ہیں۔ اسی طرح یہ بات بھی واضح ہوگی کہ شریعت کا مصدر صرف وحی ہے جب کہ اجتہادی احکام کے مصادر میں وحی کے علاوہ اجتہاد اور اس کے مختلف وسائل اور طریقے بھی شامل ہیں۔ یہاں یہ بھی ذہن میں رہے کہ ماضی میں فقہاء نے "مصادر" یا مصادر شریعت" یا "مصادر فقہ" کی اصطلاح کبھی استعمال نہیں کی بلکہ اس کی بجائے وہ "ادلہ" اور "ادلتہ الاحکام" اور "امارات" کی مصطلحات استعمال کرتے رہے ہیں جن کا فرق مصدر سے واضح ہے۔

---

[1] النحل: ۱۱۶۔

[2] المائدہ: ۴۴۔

[3] آل عمران: ۸۵۔

عربی میں تو شریعت اور فقہ کا فرق واضح کیا جا سکتا ہے لیکن جب ان مفاہیم کو دوسری زبانوں میں منتقل کیا جائے تو مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے مثلاً اردو میں "اسلامی قانون" اور انگریزی میں (Islamic Law) کا مفہوم کیا ہوگا؟ اس سے مراد یا تو شریعت کے منصوص احکام لیے جا سکتے ہیں یا پھر اجتہادی احکام۔ اگر آپ اس سے مراد بیک وقت دونوں لیں گے تو پیچیدگیاں پیدا ہوں گی کیوں کہ دونوں ایک دوسرے سے مصادر اور نوعیت کے لحاظ سے مختلف ہیں۔ مشہور مستشرق پروفیسر کلسن نے ایک پوری کتاب اس موضوع پر لکھ دی[1] کہ اسلامی قانون میں داخلی طور پر کشمکش اور تضاد ہے۔ حالانکہ بظاہر پروفیسر صاحب جو کہنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ فقہاء کے بعض اجتہادی فیصلے، ان کے خیال میں، قرآن و سنت کی تعلیمات کے مطابق نہیں ہیں لیکن چونکہ وہ دونوں طرح کے قوانین کے لیے ایک ہی مصطلح (Islamic Law) استعمال کرتے ہیں لہٰذا خلط مبحث کی وجہ سے بات واضح نہیں کر پاتے۔

پس اگر شریعت اور اجتہاد کا یہ فرق ذہن میں رکھا جائے جس کا ذکر ہم نے کیا ہے تو اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ اولی الامر کے وہ قوانین و ضوابط جو وہ حفظ المصالح اور تنظیمی امور کے لیے جاری کرتے ہیں وہ شریعت نہیں ہیں بلکہ اجتہاد کی نوعیت کے ہیں لہٰذا حکام کے وضع کردہ یہ ضوابط نہ تو "شریعت" ہیں اور نہ ہی شریعت کا مصدر۔

یہاں اس بات کا تذکرہ بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ سعودی عرب میں اس موضوع پر باقاعدہ قانون سازی ہو چکی ہے، سعودی عرب کے مذہبی امور کے موجودہ سربراہ جناب علامہ عبدالعزیز بن باز نے جب وہ مدینہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے بادشاہ کو لکھا کہ سرکاری کاغذات میں "قانون ساز" ادارے اور افراد[1] کے لیے شارع اور مشرع کے الفاظ استعمال ہو رہے ہیں اور چونکہ علی الاطلاق شارع اللہ کے سوا اور کوئی نہیں لہٰذا اللہ تعالیٰ کے نام کے سوا کسی کے ساتھ شارع یا مشرع لکھنا غیر مناسب ہے۔ بادشاہ نے مسئلہ کابینہ کے غور کے لیے بھجوا دیا،

---

[1] Noelcoulson: Conflict and Tension in Islamic Jurisprudence: University of Chicago Press.

[1] یاد رہے کہ سعودی عرب میں "قانون سازی" کا اختیار کابینہ کو حاصل ہے جس کا صدر بادشاہ ہوتا ہے۔

جہاں یہ فیصلہ ہوا کہ شارع یا مشرع کا لفظ "قانون ساز" ادارے اور افراد کے لیے استعمال نہ کیا جائے، بلکہ متبادل الفاظ استعمال کیے جائیں [1]۔ اسی طرح یہاں "قانون" کا لفظ بھی مستعمل نہیں ہے اور اس کی جگہ "نظام" کا متبادل استعمال ہوتا ہے۔

خلیفہ اور خلافت کی صحیح شرعی حیثیت

دوسری اساسی بات جس کا سمجھ لینا ابتدا ہی میں ضروری ہے، وہ خلافت کی حقیقت ہے۔ مسلمانوں کی تاریخ میں حکومت کے سربراہ کے لیے مختلف اوقات میں مختلف اسماء والقاب استعمال ہوتے رہے ہیں مثلاً خلیفہ، امیر المومنین، امام اور سلطان وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ جب دستور اور نظام حکمرانی کی بات ہو رہی ہو تو خلافت سے مراد وہ خلافت نہیں ہو سکتی جس کی رو سے قرآن نے نوع انسان کو خدا کا خلیفہ قرار دیا ہے "[2]، بلکہ خلیفہ سے مراد مسلمانوں کی حکومت کا سربراہ ہے "[3]"

یہ جان لینے کے بعد کہ خلیفہ سربراہ مملکت کا لقب ہے اور خلافت اس نظام حکومت کا نام ہے جو پچھلی کئی صدیوں میں جاری رہا ہے، یہ بھی ذہن میں رکھنا چاہیئے کہ خلافت کا یہ سیاسی نظام ایک مخصوص زمانے میں، مخصوص حالات کی پیداوار تھا اور کوئی دائمی یا الہامی نظام نہ تھا کہ "خلافت" یا "خلیفہ" کے الفاظ یا ادارے سے کوئی شرعی تقدس وابستہ ہو، چونکہ شریعت نے مسلمانوں کو سیاسی نظام کے بارے میں بنیادی اصول عطا کرنے پر اکتفاء فرمایا ہے اور اس کا تفصیلی ڈھانچہ مقرر نہیں فرمایا "[4]"، لہذا ہر وہ سیاسی نظام جو ان بنیادی اصولوں کے مطابق اور ان کی روشنی

---

[1] ملاحظہ ہو کابینہ کا فیصلہ نمبر ۲۳۸ بتاریخ ۲/۷/۹ ۱ھ تفصیل کے لئے دیکھیئے "ڈاکٹر محمد عبدالجواد کی کتاب التطور التشریعی فی المملکۃ العربیہ السعودیہ" صفحہ ۷۷ ومابعد، طبع اسکندریہ

[2] واذ قال ربك للملئكة انى جاعل فى الارض خليفة - (البقرة : ٣٠)

[3] جیسے قولہ تعالیٰ: یا داؤد انا جعلنٰك خليفة فى الارض فاحكم بين الناس بالحق" (ص: ٢٦)

[4] از راہ حکمت نہ کہ نعوذ باللہ از راہِ کمزوری۔

میں وضع کیا گیا ہو وہ شریعت کے نقطۂ نظر سے مقبول اور اسلامی سیاسی نظام ہے قطع نظر ان اسماء اور القابات کے جو اس نظام کے اداروں کے لیے استعمال کئے جائیں۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ماضی میں فقہاء نے جہاں "خلیفہ" کے نام سے مختلف امور پر بحثیں کی ہیں موجودہ دور میں ان کا اطلاق ہر مسلم سربراہ مملکت پر ہوتا ہے، خواہ وہ "صدر" ہو یا "وزیر اعظم" "بادشاہ" یا کسی "انقلابی کمیٹی کا کمانڈر" وغیرہ۔

مسلم سربراہ حکومت کو خلیفہ کہنے کا یہ مطلب نہیں کہ وہ خدا کا خلیفہ ہوتا ہے۔ یا وہ ظل الٰہی اور خدا کی طرف سے مقرر کردہ ہوتا ہے بلکہ اس کو خلیفہ اس لیے کہتے ہیں کہ وہ امت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا نائب اور قائمقام ہوتا ہے[1] وہ خدا یا رسول کی طرف سے مقرر کردہ نہیں بلکہ امت اور اس کے اہل حل وعقد کی طرف سے اختیار کردہ ہوتا ہے، امامت میں تعیین اور اختیار کا یہی وہ بنیادی فرق ہے جس میں شیعہ حضرات نے جمہور امت سے الگ موقف اختیار کیا[2]

ان امور کی وضاحت کے بعد آیئے اب دیکھیں کہ اولی الامر کون ہیں اور ان کی اطاعت ہم پر کیوں اور کیسے واجب ہے، اس اطاعت کی حدود و شروط کیا ہیں اور ان کے جاری کردہ ضوابط و احکام کی شرعی حیثیت کیا ہے۔

اولی الامر — وجوب اطاعت

قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔

---

[1] چنانچہ روایات میں آتا ہے کہ ایک آدمی نے حضرت ابوبکرؓ سے کہا "یا خلیفۃ اللہ" تو آپ نے فرمایا کہ میں اللہ تعالیٰ کا نہیں بلکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا خلیفہ ہوں، کیونکہ خلیفہ تو غائب کا ہوتا ہے حاضر کا نہیں" دیکھیے "النظریات السیاسیۃ الاسلامیہ" الدکتور محمد ضیاء الدین الریس، طبع دار التراث ۹۷ھ، صفحہ ۱۱۳۔

[2] چنانچہ الماوردی کہتے ہیں "الامامۃ موضوعۃ لخلافۃ النبوۃ وحراسۃ الدین وسیاسۃ الدنیا" (احکام السلطانیہ صفحہ ۳ طبع دار الکتب العلمیہ بیروت)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ ۝ فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ذَٰلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا ۝ [1]

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے صاحب امر ہوں، پھر اگر تمہارے درمیان کسی معاملہ میں نزاع ہو جائے تو اسے اللہ اور رسول کی طرف پھیر دو اگر تم واقعی اللہ اور روز آخر پر ایمان رکھتے ہو۔ یہی ایک صحیح طریق کار ہے اور انجام کے اعتبار سے بھی بہتر ہے۔

یاد رہے کہ اگرچہ مفسرین نے یہ کہا ہے کہ اولی الامر کی تعریف میں حکام کے علاوہ علماء اور قبیلوں کے سردار و شیوخ وغیرہ وہ سب لوگ شامل ہیں جو مسلمانوں کے اجتماعی معاملات کے سربراہ کار ہوں[2] لیکن ظاہر ہے کہ اس کے سب سے بڑے مصداق نظم و نسق کے وہ ذمہ داران ہی ہیں جو حکومت چلاتے اور معاشرے میں نظم و نسق بحال کرتے ہیں لہٰذا اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اس آیت میں یہ حکم دیا ہے کہ وہ اصحاب امر کی اطاعت کریں اور ان سے نزاع کر کے اجتماعی زندگی میں خلل نہ ڈالیں۔ یہاں یہ بھی ذہن میں رہے کہ آیت میں اُمر کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے جو اصولیوں کے نزدیک وجوب پر دلالت کرتا ہے الا یہ کہ کوئی قرینہ ایسا ہو جو ندب و اباحت کی صراحت کرے اور چونکہ یہاں کوئی ایسا قرینہ نہیں ہے لہٰذا آیت سے اولی الامر کی اطاعت کا وجوب ثابت ہوتا ہے ان شروط کے ساتھ جن کا ذکر اس آیت میں آیا

---

[1] النساء - ۵۹

[2] السیاسۃ الشرعیۃ لابن تیمیہ صفحہ ۱۸۲ طبع دار الشعب ۱۹۷۱، نیز دیکھئے۔
تفسیر المنار لرشید رضا، جلد ۵ صفحہ ۱۶۸ [illegible]

ہے اور جن کی صراحت احادیث سے ہوتی ہے۔

قرآن حکیم کے اس اجمالی حکم کی تفصیل متعدد احادیث سے ملتی ہے مثلاً نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

ا۔ من اطاعنی فقد اطاع اللہ ومن عصانی فقد عصی اللہ، ومن یطع الامیر فقد اطاعنی ومن یعص الامیر فقد عصانی "[1]

جس نے میری اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی اور جس نے امیر (یعنی حاکم وقت) کی اطاعت کی، گویا میری اطاعت کی اور جس نے امیر کی نافرمانی کی، اس نے میری نافرمانی کی۔

ب۔ اسمعوا واطیعوا وان استعمل علیکم عبد حبشی کان راسہ زبیبۃ[2]

یعنی سنو اور اطاعت کرو اگرچہ تم پر حبشی غلام امیر بنایا گیا ہو جس کا سر منقی کشمش جیسا ہو۔

ج۔ علیك السمع والطاعة فی عسرك ویسرك ومنشطك ومكرهك واثرة علیك۔[3]

یعنی تم پر سمع واطاعت (حکمرانوں کی) واجب ہے خوشی میں اور غمی میں اور چاہے رغبت سے ہو یا بے دلی سے۔

ان احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے مطابق مسلمانوں کے امراء وحکام کی اطاعت واجب ہے، ان کی اطاعت گویا رسولؐ کی اطاعت ہے اور انکے احکام کی خلاف ورزی گویا احکام رسولؐ کی خلاف ورزی ہے چاہے حکام پسندیدہ ہوں یا کسی

---

[1] صحیح مسلم بشرح نووی جلد ۱۲: صفحہ ۲۲۳

[2] فتح الباری بشرح البخاری جزء ۱۸: صفحہ ۲۴۰: رواہ ایضاً ابن ماجہ والامام احمد

[3] صحیح مسلم بشرح نووی جلد ۱۷: صفحہ ۲۲۴:

وجہ سے ناپسندیدہ۔

ان احکامات کی حکمت عیاں ہے کہ کوئی معاشرہ اس امر کے بغیر قائم نہیں ہو سکتا اور اگر قائم ہو جائے تو باقی نہیں رہ سکتا جب تک اس میں حکام کی اطاعت نہ کی جائے کیونکہ حکام سے بغاوت اور عدم تعاون کا مطلب ہی یہ ہے کہ معاشرے میں انتشار اور انارکی پھیل جائے۔ ایسے معاشرے میں نہ تو حدود اللہ قائم کی جا سکتی ہیں اور نہ ہی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا صحیح نظام قائم کیا جا سکتا ہے۔

اطاعت اولی الامر کی حدود و قیود

لیکن ان شرعی احکام سے یہ نتیجہ نکالنا بھی صحیح نہ ہو گا کہ شارع نے امت کو مطلق اطاعت کا حکم دیا ہے کہ ہر حالت میں اطاعت کی جائے کیونکہ اگر ایسا کیا جاتا تو اس کا نتیجہ حکام کی آمریت اور استبداد کی صورت میں نکلتا جو یقیناً شارع کا مقصود نہیں تھا لہٰذا اس اطاعت کی حدود مقرر کر دی گئی تاکہ جہاں حکام کو اطاعت کروانے کا حق ہو وہاں ان کی ذمہ داریاں بھی ہوں اور امت کو بھی پتہ ہو کہ اولی الامر کی اطاعت کس حد تک اور کہاں تک واجب ہے۔ قرآن و سنت سے اطاعتِ اولی الامر کی جن قیود و شروط کا پتہ چلتا ہے وہ یہ ہیں۔

۱۔ اولی الامر مسلمانوں میں سے ہو

یہ بات آیت اولی الامر سے ثابت ہوتی ہے جہاں یہ کہا گیا ہے "واولی الامر منکم" یعنی اطاعت واجب ہے ان اولی الامر کی جو مسلمانوں میں سے ہوں۔ ظاہر ہے حکام مسلمان ہوں گے تو اسلام کے مطابق حکم دیں گے اور حدود قائم کریں گے، اگر وہ خود ہی غیر مسلم ہوں تو اسلام کی بجائے غیر اسلام کی دعوت دیں گے اور امت مسلمہ کو غیر اسلام پر ہی چلائیں گے اس صورت میں اطاعت کا کوئی تصور کیا ہی نہیں جا سکتا!

۲۔ اولی الامر شریعت قائم کرنے والے ہوں

یہ بات بھی آیت اولی الامر ہی سے ثابت ہوتی ہے جس میں اطاعت کا حکم دینے

کے بعد یہ کہا گیا ہے کہ پھر اگر تمہارے درمیان کسی معاملے میں نزاع ہو جائے تو اسے اللہ اور رسول کی طرف پھیر دو۔ گویا یہ کہا جا رہا ہے کہ ان کی اطاعت کرو اگر وہ خدا اور رسول کو آخری سند اور مرجع مان لیں۔ اور اگر وہ ایسا نہ کریں تو ظاہر ہے کہ، اطاعت کے حقدار نہ ہوں گے [۱]

ابو عبید القاسم نے کتاب الاموال میں حضرت علی سے روایت کیا ہے کہ

حق علی الامام ان یحکم بما انزل اللہ و یودی الامانۃ فاذا فعل ذلک فحق علی الرعیۃ ان یسمعوا و اطیعوا۔ [۲]

یعنی امام کا فرض ہے کہ وہ شریعت کے مطابق حکومت چلائے اور اپنی ذمہ داریاں احسن طریقے سے ادا کرے، پھر اگر وہ ایسا کرے تو رعیت کا بھی فرض ہے کہ وہ اس کی بات سنے اور اطاعت کرے۔

۳۔ عادل ہوں

اگر حکام عدل سے کام لیں تو ان کی اطاعت واجب ہے لیکن اگر وہ ظلم کریں، عدل و انصاف کی بجائے قہر اور زیادتی کی پالیسی اختیار کریں تو ان کی اطاعت واجب نہ ہوگی کیونکہ ظلم و زیادتی اللہ کی معصیت کے مترادف ہے اور جو ظالم ہو وہ عاصی اور گنہگار ہے۔ نیز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔

"لا طاعۃ لمن لم یطع اللہ" [۳]

جو اللہ کی اطاعت نہ کرے اسے اطاعت کروانے کا حق نہیں۔

عمل کی شرط بالواسطہ طور پر قرآن سے بھی ثابت ہوتی ہے جیسا کہ امام رازی نے کہا ہے

---

[۱] فتح الباری، جزء ۱۶، صفحہ ۲۲۸۔

[۲] کتاب الاموال، حدیث رقم ۱۱۔

[۳] مختصر شرح جامع الصغیر جزء ۳، صفحہ ۳۶۴۔

کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے حکام کو عدل وانصاف کا حکم دیا اور پھر رعایا کو اطاعت کے لیے مکلف کیا[۱]
ان کا اشارہ سورہ نساء کی آیت اولی الامر سے پہلے کی آیت کی طرف ہے جس میں کہا گیا ہے۔

ان اللہ یامرکم ان تودوا الامانات الی اھلھا واذا حکمتم بین
الناس ان تحکموا بالعدل "[۲]

یعنی اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں اہل امانت کے سپرد کرو اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ کرو۔

۴۔ لوگوں کو معصیت کا حکم نہ دیں

ایک مسلمان حکمران کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ لوگوں کو معروف کا حکم دے اور منکر سے روکے، معاشرے میں خیر اور نیکی کو پھیلائے اور برائی کا قلع قمع کرے۔ اگر وہ یہ کرے تو اس کی اطاعت ضروری ہے لیکن اگر وہ برائی پھیلائے، معصیت کا حکم دے اور خواہش ومنکرات کی اشاعت کا سبب بنے تو اس کی اطاعت نہیں کی جائے گی کیونکہ یہ امور بذات خود معصیت ہیں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ہے کہ اللہ کی معصیت میں مخلوق کی اطاعت نہیں ہوتی اور نہ کسی حاکم کی اطاعت معصیت میں میں کرنی چاہیئے صحیح مسلم میں ہے:

علی المرء المسلم السمع والطاعۃ فیما احب وکرہ الا ان یومر بمعصیۃ
فلا سمع ولا طاعۃ[۳]۔ اور فرمایا" انما الطاعۃ فی المعروف "[۴]

انہی معنوں کی ایک روایت امام بخاریؒ نے حضرت علی کی روایت سے بیان کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سریہ بھیجا اور ایک انصاری کو اس کا سالار بنایا اور اہل سریہ سے

---

[۱] تفسیر الرازی: جزء ۱۰ صفحہ ۱۴۳
[۲] النساء: ۵۸
[۳] صحیح مسلم: جزء ۱۲: صفحہ ۲۲۶: طبع القاہرہ: بشرح النووی
[۴] صحیح مسلم جزء ۱۲: صفحہ ۲۲۷

کہا کہ اس کی اطاعت کرنا، ایک دفعہ ان انصاری سردار کو غصہ آیا تو انہوں نے کہا کہ کیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تمہیں میری اطاعت کا حکم نہیں دیا تھا، صحابہ نے کہا، دیا تھا، تو انہوں نے کہا لکڑیاں جمع کر کے آگ جلاؤ اور اس میں کود جاؤ تو صحابہ نے لکڑیاں جمع کیں اور آگ جلائی لیکن وہ اس میں کودنے میں متردد ہوئے، ان میں سے ایک نے کہا ہم نے آگ سے بچنے ہی کی خاطر تو نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اطاعت کی تھی پھر اس میں داخل کیوں ہوں؟ اسی بحث میں آگ ٹھنڈی پڑ گئی، پھر جب واپسی پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس واقعے کا ذکر کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ اگر تم لوگ آگ میں گھس جاتے تو اس سے کبھی نہ نکلتے، اطاعت تو صرف معروف میں ہے۔" [1]

اسی طرح بخاری و مسلم دونوں نے حضرت عبادہ بن صامت کی یہ روایت نقل کی ہے کہ:

"دعانا النبی صلی اللہ علیہ وسلم فبایعناہ، فقال: فیما اخذ علینا، ان بایعنا علی السمع والطاعۃ فی منشطنا ومکرھنا وعسرنا ویسرنا واثرۃ علینا وان لا ننازع الامر، اھلہ، الا ان تروا کفرا بواحا عندنا من اللہ فیہ برھان۔" [2]

حدیث کا خلاصہ یہ ہے کہ ہر حالت میں حاکم کی اطاعت کی جائے الا یہ کہ اس سے کفر صریح سرزد ہو جس صورت میں عدم اطاعت کے لیے رعایا کے پاس واضح دلیل ہوگی اور حضرت علی کی روایت سے بھی یہی مترشح ہوتا ہے کہ جہاں تک مباح امور کا تعلق ہے امیر کی اطاعت ضروری ہے (یعنی صحابہ کرام نے لکڑیاں جمع کیں اور آگ جلائی) لیکن جہاں خلاف شرع حکم دیا گیا وہیں سے امیر کی اطاعت ختم ہو گئی (یعنی آگ میں کود جانے کا حکم)

یہ چار شرائط جو قرآن و سنت سے ثابت ہیں اگر حکام میں پائی جائیں تو ان کی اطاعت

---

[1] فتح الباری جزء ۱۸: صفحہ ۱۴۷

[2] اللؤلؤ والمرجان: رقم ۷: ۱۷۱۷ صفحہ ۴۸۷ / ۴۸۳

واجب ہے اور جو ان شرائط کی موجودگی میں مسلمان حکمرانوں کی اطاعت سے انکار کرے وہ باغی اور قابل قتل ہے کیوں کہ وہ مسلمان معاشرے میں فتنے، انتشار اور انارکی کا دروازہ کھولتا ہے جیسا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ہے: انه ستكون هنات وهنات، فمن اراد ان يفرق امر هذه الامة وهي جميع فاضربوه بالسيف كائناً من كان۔ [1]

یعنی میرے بعد یوں اور یوں ہوگا، پھر جو کوئی امت میں تفرقہ ڈالے (اپنی امارت کا دعویٰ کرے) جب کہ وہ (پہلے سے ایک امیر پر) مجتمع ہو تو اس کی گردن مار دو خواہ وہ کوئی بھی ہو۔

اس کے برعکس تصویر کا دوسرا رخ یہ ہے کہ اگر کسی مسلمان معاشرے میں حاکم وقت کی مرضی سے یا اس کی موجودگی میں حدود اللہ توڑی جا رہی ہوں، منکرات و فواحش کا چرچا اور انتشار ہو، برائی غالب ہو اور نیکی دبائی جا رہی ہو تو پھر یہ بھی احادیث ہی سے ثابت ہوتا ہے کہ ایسے حاکم کی اطاعت نہ صرف یہ کہ واجب ہی نہیں ہے بلکہ اس کے خلاف جدوجہد کرنا عین مطلوب اور کارِ ثواب ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ہے۔

افضل الجهاد كلمة عدل عند سلطان جائر۔ (۲)

یعنی ظالم حاکم کے سامنے کلمہ حق کہنا افضل ترین جہاد ہے۔

اب ظاہر ہے کہ اگر حاکم کی ہاں میں ہاں ملائی ہو تو کسی جہاد کی ضرورت نہیں پڑتی، بلکہ اس کی ضرورت تو اس وقت پڑتی ہے، جب اس سے اختلاف رائے ہو اور اس کی مرضی کے خلاف حق بات اس کے سامنے رکھی جائے۔ اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اگر حاکم کی رائے اسلامی مقتضیات کے مطابق نہ ہو تو اس سے لازماً اختلاف کرنا چاہیئے اور حق بات اس پر واضح کرنی چاہیئے اور اس اختلاف رائے اور احقاق حق کو نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے جہاد قرار دیا گویا ایسا اختلاف اور اس کے لیے جدوجہد کرنے والا مجاہد کا درجہ رکھتا ہے۔

---

[1] صحیح مسلم بشرح النووی جزء ۱۲: صفحہ ۲۴۱

[2] سنن ابی داؤد جزء ۳: صفحہ ۵۱۴: طبع استانبول ۱۴۰۱ھ

اسی طرح آپ کا قول ہے کہ:

"انصر اخاك ظالمًا او مظلومًا" [1]

یعنی اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم۔

اور مزید وضاحت کی کہ ظالم کی مدد یہ ہے کہ تم اسے ظلم سے باز رکھو، اب اگر ظالم کو ظلم سے باز رکھنے کی کوشش ہو تو نہ صرف اس سے اختلاف رائے ہی ہوگا بلکہ ضرب اور مقاتلے تک نوبت پہنچ سکتی ہے۔

یہاں تک کی بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ مسلمانوں کو اولی الامر کی اطاعت کی حکم دیا گیا ہے جب تک کہ وہ ان میں سے ہو، قرآن وسنت کے مطابق حکومت کرے، عدل سے کام لے اور معصیت اور خلاف شریعت حکم نہ دے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اولی الامر کے تشریعی کام کی نوعیت کیا ہے اور اس کا دائرہ کار کیا ہے؟

اولی الامر — تشریعی دائرہ کار

جہاں تک مسلمان حکام کی تشریعی حیثیت کا تعلق ہے تو بعض لوگ غلط فہمی سے یہ سمجھتے ہیں کہ جس طرح انہیں انتظامی اختیارات حاصل ہوتے ہیں اسی طرح وہ تشریعی اختیارات کے بھی حامل ہیں جب کہ حقیقت اس کے برعکس یہ ہے کہ:

۱۔ اس کائنات کا حقیقی مالک اللہ تعالیٰ ہے [2]؛ انسان کو اس نے زمین میں اپنا خلیفہ بنا کر بھیجا ہے [3] اور اسے تصرف کے اختیارات دیئے ہیں، اس نے انتہائی مہربانی سے ہماری رہنمائی کا کام اپنے ہاتھ میں رکھا ہے اور ہمیں یہ بتانے کا انتظام کیا ہے کہ وہ کون سا صحیح راستہ ہے جس پر ہم چلیں تو دنیا و آخرت دونوں میں کامیاب و کامران

---

[1] صحیح بخاری، جزء ۳، صفحہ ۹۸، طبع استانبول ۱۴۰۱ھ

[2] وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ (آل عمران: ۱۰۹)

اَللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ۔ (الزمر: ۶۲)

[3] هُوَ الَّذِيْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ فِي الْاَرْضِ فَمَنْ كَفَرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُهٗ۔ (فاطر: ۳۵)

رہیں گے؛ اس سلسلے میں وہ پیغمبر مبعوث فرماتا ہے اور ان کے ذریعے اپنا قانون عام انسانوں تک پہنچاتا اور واضح کرتا ہے [۱] لیکن جو مختلف ادارے انسان اپنی زندگی گزارنے کیلئے بناتا ہے (مثلاً حکومت کی صورت میں معاشرے کی تنظیم) تو ان اداروں کے سربراہوں کو اللہ تعالیٰ خود مقرر نہیں کرتے اور نہ وہ اس کے نمائندے یا اس کا سایہ (ظل اللہ) ہوتے ہیں۔ شیعہ حضرات کو چھوڑ کر ساری امت اس بات پر متفق ہے کہ خلیفہ (یعنی حاکم وقت) اللہ تعالیٰ کے تعین سے نہیں بلکہ مسلمانوں کے اختیار سے منصب سنبھالتا ہے "۲" عوام ہی اسے یہ منصب عطا کرتے ہیں اور وہی اس سے یہ منصب چھین سکتے ہیں۔

۲۔ اسی طرح یہ بات بھی امت میں متفق علیہ ہے کہ انسانوں کے معاملات میں، خواہ وہ انفرادی ہوں یا اجتماعی، حکم اور قانون اللہ کا چلے گا بلکہ یہ ان کا فیصلہ نہیں خود اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہے "۳" اور مسلمان اس چیز کے مکلف ہیں کہ وہ بلا حیل وحجت اس کے حکم کو دل و جان سے مانیں "۴"

۳۔ رہ گئی یہ بات کہ جہاں یہ واضح نہ ہو کہ اللہ کا حکم کسی خاص معاملے میں کیا ہے؛ یا اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت سے بعض معاملات میں صرف اصول وقواعد بیان کرنے پر اکتفا فرمایا ہے اور اس کی تفصیل کا تعین کرنا مقصود ہو تو اس کیلئے اللہ تعالیٰ نے جس بات کو شرط ٹھہرایا ہے وہ اولی الامر ہونے کے علاوہ علم ہے۔

---

[۱] وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ۔

[۲] وَاَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ۔ (النحل: ۴۴)

[۳] اصول الدین لعبدالقاہر البغدادی، صفحہ ۲۷۹، طبع بیروت ۱۹۸۰ء

[۴] اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ۝ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ، ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ۔ (یوسف: ۴۰)
يَقُوْلُوْنَ هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَيْءٍ، قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ۔ (آل عمران: ۱۵۴)

وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰى اُولِى الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ [1]

یعنی جب کوئی قابل ذکر واقعہ ہو جائے تو چاہیئے کہ اسے ایسے اولی الامر کے پاس لے جایا جائے جن میں استنباط کی صلاحیت ہو۔ اور ظاہر ہے کہ استنباط کی صلاحیت اہل علم و فکر ہی کو ہوتی ہے۔

فَاسْئَلُوْا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ [2]

یعنی اہل ذکر سے پوچھ لو اگر تم نہیں جانتے۔ سیاق و سباق سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں اہل ذکر سے مراد اہل کتاب یا اہل علم بھی وہ جو قرآن و سنت کے علوم کے ماہر ہوں [3]

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سے بھی یہی پتہ چلتا ہے کہ اگر دینی امور میں رہنمائی کا منصب وہ لوگ سنبھال لیں جو بے علم ہیں تو وہ خود بھی گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے چنانچہ بخاری میں ہے:

ان اللہ لا یقبض العلم انتزاعًا ینتزعہ من الناس ولکن یقبض العلم بقبض العلماء حتی اذا لم یترک عالمًا اتخذ الناس رؤساء جہالا فسئلوا فافتوا بغیر علم فضلوا واضلوا" [4]

خلاصہ کلام یہ کہ ایک اسلامی مملکت میں حاکم کا بنانا اور اتارنا۔ امت کے ہاتھوں میں ہے لیکن جہاں تک اس امر کا تعلق ہے کہ مسلمان معاشرے میں حکم اور قانون کس کا چلے گا تو وہ صرف خدا کا چلے گا جسے شریعت کہا گیا ہے اور مسلمان امت یا اس کے حکمران اس

---

[1] النساء: ۸۳

[2] النحل: ۴۳

[3] الحکومۃ الاسلامیہ للمودودی: صفحہ ۱۳۰: طبع المختار الاسلامی بالقاہرہ

[4] صحیح بخاری جزء: ۴۳: طبع استانبول ۱۹۸۱ء

میں کوئی معمول سے معمولی تبدیلی لانے کے بھی مجاز نہیں ہیں اور نہ اپنی طرف سے کوئی ایسا قانون بنا کر پیش کر سکتے ہیں جو شریعت کے خلاف ہو۔

تاہم مذکورہ بالا حقیقت کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اسلام کے نظام قانون میں انسانی عقل اور غور و فکر کا کوئی مقام نہیں ہے کیونکہ یہ بات معروف ہے کہ قرآن و سنت کی نصوص محدود ہیں اور مسائل زندگی لامحدود لہٰذا شریعت (یعنی قرآن و سنت) ان معنوں میں تو ضرور مکمل ہے کہ وہ انسانی زندگی کے سارے مسائل کا حل بتاتی ہے، بعض کا تفصیل کے ساتھ اور بعض کے بارے میں اصول و قواعد وضع کر کے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ بعثت نبوی سے لے کر قیامت تک جتنے فرعی اور تفصیلی معاملات پیش آئیں گے ان سب کے بارے میں قرآن و سنت میں نصوص موجود ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شریعت کے مکمل ہونے کے باوجود اس میں انسانی عقل اور غور و فکر کے لیے ایک وسیع دائرہ کار موجود ہے۔ اس دائرہ کار کی اہم صورتیں یہ ہیں۔

۱۔ جن امور میں اللہ تعالیٰ نے تفصیلی احکام دیئے ہیں ان سے ملتے جلتے معاملات میں انہی احکام کی تطبیق۔

قواعد عامہ کا فروعات پر انطباق۔

قرآن و سنت کی نصوص کی تشریح و تفسیر، جہاں اس کی گنجائش ہو۔

منصوص احکام کی عملی تطبیق کے لیے ذیلی اور تفصیلی قواعد بنانا

عرف پر مبنی رسوم و رواج کی تصویب جو شریعت کے خلاف نہ ہوں

مقاصدِ شریعت کی روشنی میں غیر منصوص مصالح عامہ اور دیگر تنظیمی امور کیلئے قواعد سازی۔

یہ وہ امور ہیں جن میں شریعت کو ملک کا بالاتر قانون ماننے کے باوجود اور یہ تسلیم کر لینے کے باوجود کہ انسان اپنا شارع خود نہیں بلکہ شارع صرف خدا اور اس کا رسول ہے اولی الامر کے لیے اجتہاد کا دائرہ کار موجود ہے۔ تاہم اس کے لیے سب سے بڑی شرط جو اولی الامر میں مطلوب ہے وہ علم کی ہے جیسا کہ ابھی اشارۃً اس کا ذکر ہوا۔

اگر ہم اس امر کا مطالعہ اسلامی اصول فقہ کی روشنی میں کریں تو ہمیں اس پر ماہرین

اصولِ فقہ کا اجماع نظر آتا ہے کہ اس کام کے لیے "مجتہد" ہونا شرط ہے یعنی جو اجتہاد کرنا چاہے ضروری ہے کہ اس میں مجتہد کے اوصاف ہوں اور مجتہد کے اوصاف کا خلاصہ یہ ہے کہ اسے قرآن و سنت اور ان کے علوم کا نیز عربی زبان اور اصول فقہ کا ماہر ہونا چاہیئے نیز اسے عوامی مسائل سے باخبر ہونے کے علاوہ متقی اور پرہیزگار ہونا چاہیئے تاکہ لوگ علمی اور دینی معاملات میں اس کی رائے پر اعتماد کر سکیں [1]

ماہرین اصول فقہ کے علاوہ اسلام کی سیاسی فقہ پر لکھنے والے فقہاء نے بھی خلیفہ (یعنی مسلمان حاکم) میں اجتہاد کی صفت کو ضروری قرار دیا ہے ان میں ابوالحسن الماوردی، ابویعلی الفراء، ابن خلدون عبدالقاہر البغدادی، ایجی اور کردستانی قابل ذکر ہیں [2] خلافت کے ملوکیت میں تبدیل ہو جانے اور حالات کے بدل جانے سے جب یہ صفت عملاً حکمرانوں میں موجود نہ رہی اور نہ اس کے رہنے کا کوئی امکان نظر آیا تو متاخرین نے یہ رائے قائم کی کہ ایسا شخص بھی مسلمانوں کا حاکم ہو سکتا ہے جس میں اجتہاد کی صفت نہ پائی جاتی ہو لیکن اس صورت میں ضروری ہوگا کہ اس کے ہاں مجتہدین کی ایک جماعت ہو جس سے وہ بوقت ضرورت رائے اور مشورہ لے سکے [3] اور ویسے بھی مسلمان حکمران کا یہ فرض ہے کہ وہ مسلمانوں کے اہل حل و عقد سے مشورہ کرتا رہے کیونکہ شوریٰ کا ادارہ اسلام کے سیاسی نظام میں بنیادی اہمیت کا حامل ادارہ ہے اور اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مشورے کا حکم دے کر [4]

---

[1] اصول فقہ کی قدیم و جدید کتب میں یہ مباحث تفصیلاً موجود ہیں دیکھئے مثال کے طور پر: المستصفیٰ للغزالی ج ۲؛ ص ۳۵۰۔ ارشاد الفحول للشوکانی: ص ۲۵۲۔ روضۃ الناظر و جنۃ المناظر لابن قدامہ: ص ۴۰۳، الموافقات للشاطبی: ج ۴؛ ص ۱۰۸۔ نہایۃ السول للاسنوی: ج ۳؛ ص ۵۱۷ وغیرہ۔

[2] دیکھئے الاحکام السلطانیہ للماوردی: ص ۷؛ الاحکام السلطانیہ للفراء: ص ۷۰؛ اصول الدین للبغدادی ص ۲۸۸؛ المواقف و شرحہ: ص ۵۰۷۔ تقریب المرام فی شرح تہذیب الکلام: ص ۲۱۷؛ المقدمہ لابن خلدون: ص ۲۱۲ و المغنی فی ابواب التوحید والعدل: ج ۲۰؛ ص ۲۰۸۔ ۲۰۹۔

[3] شہرستانی کی الملل والنحل: ج ۱؛ ص ۱۷۰ اور السامرہ بشرح المسامرہ: ص ۲۷۷۔ [4] وشاورھم فی الامر۔ آل عمران: ۱۵۹۔

اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حکم پر عمل کرتے ہوئے (حالانکہ آپ پر وحی نازل ہوتی تھی) اپنے اسوہ سے شوریٰ کی اہمیت واضح کر دی ہے [1] بلکہ بعض علماء نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ اگر امیر استبداد سے کام لے اور مشورے سے انکار کرے تو اس کا عزل واجب ہے [2]

"خلافت" کا جو سیاسی نظام اوائل عہدِ اسلام میں قائم ہوا اس میں چونکہ زیادہ تر اختیارات ایک فرد (یعنی خلیفہ یا امیر المومنین) کے پاس تھے لہٰذا شوریٰ کے ادارے کی صورت میں چیک اینڈ بیلنس کا ایک حسین امتزاج وجود میں آگیا (اگرچہ حقیقی ورع تقویٰ اور خدا خوفی کا تھا) لیکن خلافت راشدہ کے بعد خلافت کا سیاسی نظام پٹڑی سے اتر گیا، خلافت نام کو تو باقی رہی لیکن اس سے شورائیت کی روح ختم ہوگئی اور عملاً ملوکیت اور استبداد میں بدل گئی۔

خلافت راشدہ میں چونکہ خلفاء خود مجتہدین میں سے تھے اس لیے وہ خود فیصلے کر سکتے تھے لیکن تاریخ شاہد ہے کہ انھوں نے کبھی کوئی بڑا فیصلہ تنہا اپنی آزاد مرضی سے نہیں کیا بلکہ ہمیشہ شوریٰ سے مشورہ کیا اور اسے قبول کیا۔ بعض لوگوں کا یہ استنباط جو وہ خلافتِ راشدہ کے ایک دو واقعات (مثلاً مانعین زکوٰۃ کے خلاف جنگ یا جیشِ اسامہ بھیجنے کا فیصلہ) سے کرتے ہیں وہ ایک غلط استنباط ہے کیوں کہ جب حضرت ابوبکرؓ نے دلائل دیئے تو لوگوں نے سرِ تسلیم خم کر دیا اور ان کی رائے کو تسلیم کر لیا اس طرح ان فیصلوں میں دیگر صحابہ کرامؓ کی رائے بھی شامل ہوگی۔ حضرت ابوبکرؓ نے جو باتیں کہیں یا ان کی رائے کے برعکس دوسروں نے جو کچھ کہا ان کی حیثیت فیصلہ ہونے سے پہلے کی بحث و مناقشہ کی سی ہے جیسا کہ اجتماعی معاملات میں مشاورت کرتے ہوئے ہر طرح کی باتیں سامنے آتی ہیں لیکن حقیقی فیصلہ تو وہ ہوتا ہے جس پر بحث و مناقشے

---

[1] حضرت ابوہریرہؓ کا قول ہے "ما رأیت احداً اکثر مشورۃ لاصحابہ من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم"، یعنی میں نے کسی کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر صحابہ سے مشورہ کرنے والا نہیں پایا (ترمذی)، باب المشاورۃ، ج ۵: ص ۳۷۵ طبع القاہرہ۔

[2] تفسیر القرطبی: ج ۴: ص ۲۴۹ - ۲۵۱ طبع دار المعرفت بیروت تفسیر الکبیر لفخر الرازی: ج ۳: ص ۱۷۰- ۱۲۲ طبع القاہرہ

کے بعد فیصلہ ہو نہ کہ وہ آراء جو دورانِ مناقشہ سامنے آئیں۔

خلفاء راشدین خصوصاً حضرت عمرؓ کے طرزِ عمل سے پتہ چلتا ہے کہ اس زمانے میں شوریٰ کے دو حلقے تھے۔ ایک حلقہ جس میں اکابر اور اہلِ علم صحابہ شامل تھے اس میں دقیق فقہی علمی مسائل زیرِ بحث آتے تھے اور دوسرا عمومی حلقہ یعنی اکابر صحابہ بشمول اوس و خزرج اور قریش کے مختلف قبیلوں کے سربراہ وغیرہ جس میں عمومی مسائل زیرِ بحث آتے تھے مثال کے لیے دیکھئے حضرت عمرؓ کا طرزِ عمل طاعون عمواس اور قضیۂ ارض سواد میں[1] خلفاء راشدین کے اس طرزِ عمل سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ شوریٰ کے ایک سے زیادہ حلقے ہو سکتے ہیں۔ شوریٰ کے سارے ممبران میں اگر دقیق علمی اور فقہی معاملات میں مجتہدانہ بصیرت سے رائے دینے کی صلاحیت نہ ہو تو بھی کم از کم شوریٰ کے کچھ ارکان میں تو یہ صفت ضرور موجود ہونی چاہیئے۔

اولی الامر کا تشریعی دائرہ کار اور عصری تطبیقات

اوپر جو کچھ ہم نے عرض کیا ہے وہ مسئلہ زیرِ بحث کی علمی اور نظری پوزیشن تھی اب دیکھنا یہ ہے کہ جو حالات عملاً ہمارے ہاں خصوصاً اور دیگر اسلامی ممالک میں عموماً موجود ہیں ان کی موجودگی میں مسئلہ زیرِ بحث کی عملی صورت کیا ہو گی یہاں بھی چند باتیں بطور مقدمہ عرض کی جانی ضروری ہیں:۔

پچھلی چند صدیوں کے انحطاط کے نتیجے میں مغربی اقوام مسلمان حکومتوں پر غالب آگئیں اور جیسا کہ دستور ہے انہوں نے صرف ملک ہی فتح نہیں کیے بلکہ محکوموں کے فکر و نظر اور ان کے تہذیب و تمدن کو بھی بدل ڈالا، ان کے نظامِ معیشت و معاشرت کو اپنے رنگ میں رنگا اور نظامِ تعلیم کو بھی اپنے نظریات اور اغراض کے مطابق استوار کیا۔ مغربی قوموں کے اس تہذیبی غلبے اور نظریاتی استیلاء کے دور رس نتائج نکلے:۔

---

[1] کتاب الأموال لابی عبید القاسم ج ۱: ص ۸۳ طبع القاہرہ، کتاب الخراج لابی یوسف: ص ۷۸، طبع قاہرہ:

۱۔ مسلمانوں کا نظام تعلیم ختم ہونے سے علوم دینیہ سے عمومی طور پر عدم واقفیت پیدا ہوگئی، جو لوگ نئے نظام تعلیم سے فارغ ہو کر نکلے ان کے لیے استعماری طاقتوں نے باقاعدہ منصوبہ بندی کی کہ وہ جو کچھ چاہیں بنیں لیکن بہر حال اچھے مسلمان بن کر ان درسگاہوں سے نہ نکلیں اور اس سکیم میں وہ کامیاب رہیں۔

۲۔ استعماری طاقتوں کے خلاف ابتداء میں جنتی طاقتیں مزاحم ہوئیں (خواہ برصغیر ہو یا دیگر مسلم ممالک) وہاں ان کی قیادت علماء کے ہاتھ میں تھی لیکن استعماری طاقتوں نے ان کو بزور کچل دیا اور پھر آہستہ آہستہ "جمہوریت" کے نام پر ایک ایسی قیادت کو ابھرنے کا موقع دیا جو ان کے قائم کیے ہوئے تعلیمی اداروں کی فارغ التحصیل تھی۔ ان کی تہذیب و تمدن کی رسیا تھی اور ان کے نظام زندگی کو قبول کیے ہوئے تھی۔ اور پھر جب حالات کے دباؤ کے تحت بالآخر ان مغربی استحصالی قوتوں کو اپنا بوریا بستر سمیٹنا پڑا تو وہ اقتدار انہی قوتوں کے حوالے کر کے گئی یعنی جمہوری پیشوا سیاستدان، سرمایہ دار اور جاگیر دار، اور سول اور ملٹری بیوروکریسی وغیرہ۔ سادہ دل مسلمان عوام جو اپنے عقائد کے زیر اثر ہر صورت میں اسلام کے حامی تھے اور وہ دینی قوتیں جو اسلام کو نافذ و غالب دیکھنا چاہتی تھیں، جس طرح مغربی استعمار کے زمانے میں مقہور و مغضوب تھیں نام نہاد آزادی کے بعد بھی مقہور و مغضوب رہیں بلکہ اکثر حالات میں اپنوں کے ستم غیروں سے بھی بڑھ گئے۔

؎ من از بیگانگاں ہرگز نہ نالم
کہ با من ہر چہ کرد آں آشنا کرد

۳۔ مغربی قوموں نے مسلمان ملکوں میں جہاں بھی غلبہ پایا اسلامی قوانین ختم کر دیئے تو یہ کوئی اچنبھے کی بات نہ تھی کیوں کہ دشمنوں سے تو توقع ہی دشمنی کی ہوتی ہے دوستی کی نہیں لیکن افسوس کہ ہمارے مسلمان حکمرانوں نے اپنے ہاتھوں شرعی قوانین کو ختم کیا۔ مغربی استیلاء سے پہلے ترکی میں (تنظیمات کے نام پر) اور مصر میں محمد علی کے زمانے میں یورپی قوانین کی نقالی اور چربہ سازی ہونے لگی، پھر ایران میں رضا شاہ

پہلوی اور ترکی میں اتاترک نے کھلم کھلا شرعی قوانین کی دھجیاں بکھیر دیں، پھر جوں جوں مسلمان ملک آزاد (؟) ہوتے گیے اپنے دستوروں میں اور قوانین کے مسودوں میں مغربی قوانین کی نقالی کرتے چلے گیے اور شریعت اپنے متبعین کا منہ دیکھتی رہ گئی۔[1]

بعض دیندار حلقوں نے اس صورت حال پر احتجاج ضرور کیا لیکن وقت کی گاڑی ان کے پکڑے تھم نہ سکی۔

۴۔ اوپر ذکر کردہ حالات کے زیر اثر جتنی بھی مسلمان حکومتیں بنیں ان کی اکثریت (خواہ وہ پیشہ ور سیاستدان تھے یا سول اور ملٹری بیوروکریسی کے نمائندے) آمریت پر منتج ہوئی جنہیں مسلمان عوام اور ان کی دینی اقدار کا اتنا ہی پاس تھا جتنا اپنی حکومت کے مفاد کے لیے وہ ضروری سمجھتے تھے۔ پارلیمنٹ کے نام سے ٹوٹے پھوٹے اور لولے لنگڑے ادارے اگر بنائے بھی گیے تو انہیں چلنے نہیں دیا گیا اور دیا گیا بھی تو ایسا انتظام دیا گیا کہ مسلمانوں کی حقیقی رائے عامہ جو صحیح اسلامی نظام چاہتی ہے کبھی منظم ہو کر غالب نہ آسکے، انتخابی قوانین ناقص بنائے گئے، قبیلوں، برادریوں اور دھڑے بندیوں کے ناجائز اثرات اور سرمائے کو استعمال کیا گیا، جھرلو، دھاندلی، جعلی ووٹنگ، غلط انتخابی فہرستیں، ووٹوں کی خرید و فروخت، گنتی میں بے ایمانی غرض ہر قابل تصور ناجائز ذریعہ استعمال کر کے مفاد یافتہ طبقوں کو کامیاب کروایا گیا اور اسلامی قوتوں نے جہاں بھی ان سے کش مکش کی ان کو ناکام کروایا گیا۔ ان حالات میں مسلمان ملکوں میں جمہوریت کے نام پر جو کچھ بھی اور جہاں بھی تماشا ہوا اس کا نتیجہ یہی نکلا کہ اقتدار ہمیشہ غیر اسلامی قوتوں

---

[1] تفصیل کے لیے: صبحی محمصانی، الاوضاع التشریعیۃ فی الدول العربیۃ ص ۱۷۱ وما بعد ہا طبع دار العلم للملایین ۱۹۷۸ نیز

H. Liberrsny: Laws of Near + Middle east. p.4: State University of N.Y. Presss.

کے ہاتھ میں رہا۔

اب ان حالات کو ذہن میں رکھئے اور تصور کیجئے کہ جو لوگ آج مسلمان ملکوں میں برسرِ اقتدار ہیں (بشمول پاکستان) ان کے اُولی الامر ہونے کی شرعی پوزیشن کیا ہے؟ اور جو "احکام" وہ جاری کر رہے ہیں ان کی شرعی حیثیت کیا ہے۔؟

پارلیمنٹ کا حق "قانون سازی" اور اس کی شرعی حیثیت

موجودہ زمانے میں حکومتی ڈھانچہ عام طور پر تین بڑے اداروں میں تقسیم ہو چکا ہے، مقننہ یعنی پارلیمنٹ کا (بڑا) کام قانون بنانا ہے، انتظامیہ جس کا کام اس قانون پر عمل درآمد کرنا ہے اور عدلیہ جس کا کام بوقت ضرورت قانون کی تفسیر و تعبیر اور تنازع کی صورت میں فیصلہ کرنا ہے۔ ماضی میں حکومتی ڈھانچے کی یہ تقسیم موجود نہ تھی یا کم از کم اتنی واضح نہ تھی اور مسلمان ملکوں میں حکومتی اختیارات زیادہ تر حاکم وقت (خلیفہ یا امام) کے پاس ہوتے تھے لہٰذا وہ "اُولی الامر" سمجھا جاتا تھا۔ اب حکومتی ڈھانچے کی تقسیم کے بعد (اور اس تقسیم کے کئی عوامل ہیں جن کے تجزیئے اور تحقیق کا یہاں موقع نہیں) صدر اور وزیر اعظم نیز پارلیمنٹ اور عدالتِ عالیہ کو "اُولی الامر" سمجھنے میں شرعی لحاظ سے کوئی امر مانع نہیں۔

چونکہ شریعت نے نظامِ حکومت کی کوئی خاص شکل متعین نہیں کی لہٰذا ماضی میں اگر حکومتی اختیارات ایک فرد کے پاس زیادہ تھے اور یہ نظام اسلام تھا تو اسی طرح موجودہ نظام بھی جس میں حکومتی اختیارات ایک کی بجائے متعدد افراد یا اداروں کے پاس ہیں تو اسے بھی غیر اسلامی نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ یہ ایک تنظیمی اور اجتہادی امر ہے لہٰذا وقت اور حالات کے بدل جانے سے اس تفاوت کو غیر اسلامی نہیں کہا جائے گا۔

پاکستان کی صورت یہ ہے کہ "قانون سازی" کا حق یہاں پارلیمنٹ (قومی اسمبلی اور سینیٹ) کو ہے (۱۹۷۳ء کے دستور کے مطابق) صدر کا بھی اس میں رول ہے، اور قانون کے مسودے وغیرہ بنانا اور اسمبلیوں میں اسے منظور کروانے کی جدّ و جہد کرنا انتظامیہ کی بھی دردسری ہے لہٰذا اگر پارلیمنٹ کی عارضی غیر موجودگی میں صدر مملکت کوئی "قانون" بنا کر نافذ کرے

اور بعد میں پارلیمنٹ اس کو منظور کرے تو شرعی نقطۂ نظر سے اس میں کوئی قباحت نظر نہیں آتی۔

دراصل جو مسئلہ اہم ہے وہ یہ ہے کہ کیا اس طرح کی اسمبلیوں کو، جس طرح کی کہ ہماری ہیں[1]، "قانون سازی" (ہماری اوپر بیان کردہ تصریحات کے مطابق اجتہاد) کا حق حاصل ہے؟ راقم کی رائے میں یہ حق انہیں حاصل نہیں ہے کیونکہ اجتہاد کی لازمی شرائط میں سے یہ ہے کہ اجتہاد کرنے والے مجتہد ہوں اس کی مطلوب اور معیاری صورت یہ ہے کہ مجتہدین میں وہ تمام صفات پائی جائیں جن کا ذکر اصولیوں نے متفقہ طور پر کیا ہے۔ اگر ان صفات کا مطلوبہ معیار کے مطابق موجود ہونا امر محال ہو تو بھی یہ شرائط بڑی حد تک یا کم از کم کسی نہ کسی حد تک تو موجود ہونی چاہئیں لیکن یہ بات شرعی لحاظ سے کسی طور قابل قبول نہیں ہے کہ ان لوگوں کو حق اجتہاد دے دیا جائے جو لفظ اجتہاد کے معنی بھی نہ جانتے ہوں، خواہ وہ اولی الامر ہی کیوں نہ ہوں۔

امام غزالیؒ نے بالکل بجا فرمایا ہے کہ نااہل آدمی کے اجتہاد کی مثال اندھے کی سی ہے جو نہ اپنا راستہ دیکھ سکتا ہے اور نہ کسی دوسرے کی رہنمائی کر سکتا ہے اگر وہ ایسا کرے گا تو خود بھی گمراہ ہوگا اور دوسروں کو بھی گمراہ کرے گا[2]

ہم اس دلیل کو بے وزن سمجھتے ہیں جو بعض لوگ یہ کہہ کر پیش کرتے ہیں کہ مسلمان ممالک میں اسمبلی کو حق "قانون سازی" حاصل ہے کیوں کہ اسمبلی کے ارکان کو عوام کی نمائندگی حاصل ہوتی ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ خود عوام کو حق قانون سازی" (یا صحیح طور پر حق اجتہاد) (غیر موہل ہونے کی بنیاد پر) حاصل نہیں ہے تو ان کے نمائندوں کو کہاں سے حاصل ہو جائے گا؟

دراصل یہ نقطہ نظر اسلام کا نہیں مغرب کی لادین جمہوریت کا ہے کہ عوام ہی سب

---

[1] رائج مغربی جمہوری تصور کے مطابق اسمبلی کی ممبر شپ کے لیے اہلیت اور اختصاص کوئی شرط نہیں بس اتنا کافی سمجھا جاتا ہے کہ امیدوار اس ملک کا باشندہ ہو، اس کی عمر اتنی ہو وغیرہ وغیرہ۔

[2] الرسالہ للشافعیؒ: ص ۵۰۹ طبع القاہرہ ۱۳۵۸ھ

کچھ ہیں وہی بالاتر اتھارٹی ہیں، وہ جو قانون چاہیں بنا سکتے ہیں اور جس کو چاہیں ختم کر سکتے ہیں۔ عوام کی حاکمیت کا نظریہ، اسلامی نقطۂ نظر سے، صرف جزوی طور پر درست ہے یعنی جہاں تک حکومت کے بنانے اور ختم کرنے کا تعلق ہے تو اسلامی نقطۂ نظر سے یہ بات بلاشک عوام کی مرضی اور خواہش پر منحصر ہے لیکن جہاں تک قانون بنانے کا تعلق ہے تو یہاں حاکمیت عوام کی نہیں اللہ اور اس کے قانون کی ہوگی اور جہاں حکم الٰہی موجود نہیں ہوگا وہاں وہ لوگ قیاس و استنباط وغیرہ (یعنی اجتہاد) سے کام لیں گے جو قرآن و سنت اور علوم اسلامیہ کے ماہر ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ شرط علم کی ہے، کسی طبقے کی نہیں، قانونی طور پر ہر مسلمان فقیہ اور مجتہد ہو سکتا ہے بشرطیکہ وہ اجتہاد کرنے کی صفات سے متصف ہو۔ لہٰذا یہاں یہ پھبتی کسے جانے کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ ہم اجتہاد کے حق کو "علماء" کے طبقے میں محصور کر رہے ہیں، اصولی طور پر علماء کسی طبقے کا نام نہیں بلکہ ایک صفت ہے، جو بھی اپنے اندر علم کی صفت پیدا کرے وہ عالم ہے، اسلام میں کوئی پاپویت (Priest Hood:) نہیں ہے لہٰذا جب ہم علماء کہتے ہیں تو اس سے مراد اہل علم ہیں، علوم اسلامیہ کے ماہر ہیں خواہ وہ روایتی علماء ہوں یا غیر روایتی، مدرسہ میں پڑھاتے ہوں یا یونیورسٹی میں، خواہ وہ وکیل ہوں یا جج، جن میں بھی یہ صفتِ علم ہوں وہ عالم شمار ہوں گے۔

اگرچہ اجتہاد اہل علم کا کام ہے لیکن اگر یہ حکومتی سطح پر ہو تو یہاں بھی عوامی دخل اندازی کی ایک صورت شرعاً موجود ہے اور وہ یہ ہے کہ چونکہ یہ اہل علم، اجتہاد عوام کے لیے کریں گے اس لیے یہ ضروری ہے کہ وہ عوام کے معتمد علیہ ہوں یعنی عوام کی اکثریت کو ان کے علم اور تقویٰ پر بھروسہ ہو۔ اس طرح کے اہل علم کا ایک ادارہ قومی سطح پر بنانا مقصود ہو جو سارے ملک کے مسلمانوں کے لیے اجتہادی قوانین بنائے تو اس طرح کا کوئی طریقہ اختیار کرنا عین مطلوب ہے جس سے یہ ثابت ہو کہ یہ اہل علم عوام کے معتمد علیہ ہیں۔ اس کے لیے انتخاب کا طریقہ بھی اختیار کیا جا سکتا ہے اور بعض دوسرے حل بھی آزمائے جا سکتے ہیں۔ چونکہ موجودہ حالات کے پیش نظر یہ خطرہ موجود ہے کہ اگر یہ کام حکومت اور حکمرانوں کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا تو وہ اس کا غلط استعمال کر سکتے ہیں اس لیے بہتر یہ ہوگا کہ اس کا حق اختیار

حکمرانوں کو نہ دیا جائے بلکہ یہ اختیار عوام کے پاس ہی رہے۔

پاکستان میں اس نقطۂ نظر پر عمل کرنے کی ایک اچھی صورت یہ ہے کہ انتخابات متناسب نمائندگی کی بنیادوں پر کرائے جائیں اور سیاسی جماعتوں کو پہلے سے یہ بتا دیا جائے کہ وہ اپنے کامیاب ہونے والے نمائندوں میں ایک تعداد ماہرین علوم اسلامیہ کی لازمی طور پر رکھیں اس طرح جو علماء اسمبلی میں پہنچیں ان پر مشتمل ایک "اجتہادی کمیٹی" یا "قانونی کمیٹی" بنا دی جائے جو پارلیمنٹ ہی کا ایک حصہ ہو لیکن قانونی اور فقہی امور میں اس کا کہا حرف آخر ہو یعنی دیگر ممبران اسمبلی اور صدر مملکت اس کمیٹی کے بنائے ہوئے مسودات اور بلوں کو ختم نہ کر سکیں کیونکہ غیر اہل علم ہونے کی بنیاد پر وہ اس کے اہل نہیں ہیں [1]

اس سکیم کا فائدہ یہ بھی ہوگا کہ وہ اہل علم بھی اسمبلیوں میں اس قانونی یا اجتہادی کمیٹی میں شامل ہو سکیں گے جو انتخابی جھگڑوں میں نہ پڑنا چاہیں۔

اگر انتخابات متناسب نمائندگی کی بنیاد پر نہ ہوں بلکہ براہ راست اکثریتی ووٹوں سے ہوں جیسا کہ ہمارے ملک میں عام طور پر رائج ہے تو یہاں بھی کم از کم قابل قبول صورت یہ نکل سکتی ہے کہ جو علماء اور اہل علم اسمبلی میں پہنچے ہیں ان کی ایک کمیٹی بنا دی جائے جو قانون سازی اور اجتہادی امور میں خود مختار ہو اور اسمبلی یا صدر کو اس پر کنٹرول حاصل نہ ہو، ایک اور صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اسمبلی کے ممبران علماء کی ایک تعداد میں سے کچھ علماء کو اسمبلی کا ممبر منتخب کر لیں پھر ان علماء اور اسمبلی میں موجود علماء و سکالرز کو ملا کر ایک خود مختار کمیٹی قائم کر دی جائے۔

اگر اس طرح کی کوئی صورت پیدا ہو جائے تو یہ کئی لحاظ سے اطمینان بخش ثابت ہو سکتی ہے

---

[1] اگرچہ سپریم کورٹ کو یہ اختیار دیا جا سکتا ہے کہ وہ اس کمیٹی کے پاس کردہ قوانین کا جائزہ لے سکے اگر انہیں غیر شرعی ہونے کی بنیاد پر عدالت میں چیلنج کیا جائے بشرطیکہ عدالت کے جج صاحبان اہل علم ہوں اور مجتہدین کی کم از کم شرائط پر پورے اترتے ہوں۔

شرعی لحاظ سے ایسی کمیٹی میں دونوں صفتیں ہونگی یعنی یہ اولی الامر بھی ہوگی اور صفتِ علم کی شرط پر بھی پوری اترے گی نیز چونکہ وہ عوام کے منتخب نمائندوں پر مشتمل ہوگی اس لیے اس کی حیثیت پر طعن نہیں کیا جا سکے گا تاہم ممکن ہے کہ اس طرح کی کوئی بھی سکیم مغربی جمہوریت زدگان کو پسند نہ آئے اور وہ اسے یہ کہہ کر رد کر دیں کہ یہ تو عوام اور اسمبلی پر مولویوں کو برتری دلوانے والی بات ہے کیوں کہ ان کی نظر میں معیار جمہوریت ہے اور جمہوریت بھی وہ جو مغرب سے درآمد شدہ ہے، اسلام نہیں۔ اگر وہ اسلام کو اور اس کے قانونی نظام کو سمجھتے تو کبھی یہ نہ کہتے کہ اسمبلی کے ممبران ہی صحیح قانون ساز اتھارٹی ہیں اس لیے کہ وہ عوام کے نمائندے ہیں حالانکہ ہم پہلے واضح کر چکے ہیں کہ اسلام میں تشریعی حاکمیت اللہ کی ہے، عوام کی نہیں اور ملکی سطح پر اجتہاد کے لیے دو صفات مطلوب ہیں ایک اولی الامر ہونے کی اور دوسری اہل علم ہونے کی، جو قرآن میں مذکور ہیں اگر یہ صفات موجود نہ ہوں تو جو قانون سازی ہوگی وہ جیسی بھی ہو لیکن اس کے اسلامی ہونے پر اعتماد مسلم عوام کا نہ ہوگا کیوں کہ وہ سمجھتے رہیں گے کہ یہ اجتہاد جن لوگوں نے کیا ہے وہ اس کے اہل نہ تھے۔

یہاں یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ نظریاتی کونسل کی صورت میں ایک آئینی انتظام موجود ہے اسی کو کیوں نہ مؤثر بنا دیا جائے، ہم کہتے ہیں کہ آج تک پاکستان میں جو یہ ہوتا آیا ہے کہ ایک مشاورتی کونسل بنا دی جائے جو اسلامی قانون سازی کے سلسلے میں مقننہ کو مشورے دیتی رہے، وہ مسلم عوام کو بہلانے کے ایک ذریعے کے سوا کچھ نہیں۔ کیا یہ مذاق نہیں کہ قانون بنانے کا اختیار تو ہو ان لوگوں کے ہاتھ میں جو اسلامی علوم کے ماہر نہ ہوں اور مشورے کا کام ہو ان لوگوں کے ہاتھ میں جن کے پاس اختیار نہ ہو، نتیجہ صاف ظاہر ہے کہ ان بااختیار لوگوں نے ان بے اختیار لوگوں کے مشوروں کو کبھی اہمیت نہیں دی اور نہ کبھی اس پر عمل کیا ہے۔ پچھلی نظریاتی کونسل نے انتہائی عرق ریزی سے علمی کام کیا لیکن حالت یہ ہے کہ ان کی رپورٹوں پر عمل تو کیا ہوتا، انہیں طبع کرنے اور عام لوگوں کے علم میں لانے تک کی اجازت نہیں دی گئی۔ ان حالات میں ہم پاکستان کی دینی جماعتوں، علماء اور اہل نظر اصحاب سے یہ گزارش کریں گے کہ وہ ماضی میں کیے گئے ناقص

انتظامات پر قناعت نہ کرلیں کہ آئین میں چند شقیں اسلامی رکھ دی گئیں، نظریاتی کونسل بن گئی، اسلامی ریسرچ انسٹیٹیوٹ کھول دیا گیا تو بس میدان فتح ہوگیا بلکہ تجربے نے یہ ثابت کیا ہے اس طرح وجود اور عدم بے معنی ہے اگر وہ بااختیار نہ ہو، لہٰذا اسلامی قانون سازی کے لیے ایک ایسے ادارے کے قیام کے لیے جدوجہد کی ضرورت ہے جو بااختیار بھی ہو اور اہل علم پر مشتمل بھی ہو۔ واللہ اعلم۔